ڈاکٹر محمد حمید اللہ اور علم السِیَر

ڈاکٹر زیبا افتخار☆

Abstract:

"Seerah of the Holy Prophet MOHAMMAD (ﷺ) is the Seerah of perfect human personality, unprecedented role model for the whole mankind. So it becomes most important to write and study regarding the Seerah. There are thousands of people who contributed in the vast field of Seerah writing for centuries. Dr. Hameed Ullah is one of those noble names whose work is well known contribution towards Islam. He is known by his unique style and deep scholarly approach in this regard. The following article throws light on his approach about the science of Seerah."

Key words: Study of Seerah, Perfect human personality, Seerah Writing, Science of Seerah, Dr. Hameed Ullah.

تقریباً تمام دانشورانِ عصر نے، جنہوں نے ڈاکٹر محمد حمید اللہ پر اظہار خیال کیا ہے۔ ان کے کام کو کثیر الجہتی (Multi-dimensional) قرار دیا ہے، کہ انہوں نے تحقیق کے میدان میں بڑے معرکے کی چیزیں پیش کیں۔[1] اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر حمید اللہ نے متنوع اسلامی موضوعات پر اپنی محققانہ صلاحیتوں کا لوہا منوایا، خواہ وہ میدان، تدوین حدیث کا ہو یا تدوین فقہ کا، علم السیر کا ہو یا سیرت نگاری کا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہونا چاہیے کہ ہم ان کی تحقیقاتِ علمی کو مختلف خانوں میں بانٹ کر ان کو کسی ایک زاویہ سے زیادہ بڑا یا کسی دوسرے زاویے سے کم اہم ثابت کرنا چاہیں۔ میرے خیال میں یہ ایک لاحاصل بحث ہوگی، ان کا ہر کام، دوسرے کام سے مربوط ہے، جسے علیحدہ کرنے کی صورت میں ڈاکٹر صاحب کی اصل علمی و تحقیقی دین (contribution) کی وضاحت نہیں ہو سکے گی۔ معاملہ خواہ سیرت نگاری کا ہو یا علم السیر کا، تاریخ تدوین حدیث کا ہو یا تاریخ تدوین فقہ کا، یہ سارے موضوعات ''اسلامی تاریخ'' کے موضوعات ہیں اور ڈاکٹر حمید اللہ ان پر یکساں گرفت رکھتے تھے۔ بادی النظر میں

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامی تاریخ، جامعہ کراچی، کراچی

کثیر الجہتی نظر آنے والا یہ کام، بنیادی طور پر ''اسلامی تاریخ'' پر کیا جانے والا ان کا وہ کام ہے جو بلاشبہ وسیع کینوس پر پھیلا ہوا ہے۔ وہ بنیادی طور پر ایک مورخ اور ایک قانون دان تھے۔ لہٰذا اسلامی تاریخ اور اسلامی قانون کے حوالے سے نہ صرف یہ کہ وہ ایک نیا رجحان (trend) بنانے میں کامیاب ہوئے بلکہ اسے علمی دنیا، خصوصاً مستشرقین سے منوایا بھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انہیں ہندوستان (جہاں وہ پیدا ہوئے) میں اتنے لوگ نہیں جانتے، جتنے کہ یورپ میں جانے جاتے ہیں۔

بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنی علمی زندگی کے ابتدائی پندرہ بیس سال خصوصاً، بعدازاں پوری زندگی عموماً علم السیر (اسلامی بین الاقوامی قانون) کی تحقیق میں صرف کیے۔ اس موضوع کو انہوں نے ڈی۔فل، ڈی لٹ اور پی ایچ۔ڈی کی ڈگریوں کے لیے چنا، جامعہ عثمانیہ میں وہ شعبہ دینیات کے طالب علم کی حیثیت سے داخل ہوئے، بی اے اسی شعبہ سے کیا، مگر ایم اے کی کلاسیں انہوں نے بیک وقت شعبہ دینیات اور شعبہ قانون میں ایک ساتھ لینا شروع کیں۔ بین الاقوامی سطح پر تیزی سے تبدیل ہوتے ہوئے حالات کے پیش نظر جامعہ عثمانیہ کا شعبہ قانون بھی متحرک تھا اور وقت کی ضرورتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے خدمات انجام دے رہا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد جب مجلس اقوام (لیگ آف نیشنز) قائم ہوئی اور بین الاقوامی قوانین پر پھر سے بحث ومباحثہ کا دروازہ کھلا، تو جامعہ عثمانیہ کے کلیہ قانون کے سربراہ، پروفیسر حسین علی مرزا کی کوششوں سے ایل ایل بی کے نصاب میں '' Public International Law'' کو لازمی کورس کے طور پر متعارف کرایا گیا۔ اس فیصلے کے بعد ڈاکٹر حمید اللہ پہلے بیچ (batch) کے طالب علم تھے، اور ایک ہی سال میں یعنی ۱۹۳۰ء میں ایم اے دینیات اور ایل ایل بی کی ڈگریاں ایک ساتھ حاصل کیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جب انہوں نے بین الاقوامی قانون کا مطالعہ کیا تو انہیں یہ اسلامی تاریخ اور اسلامی فقہ سے ملتا جلتا محسوس ہوا۔ اس بارے میں انہوں نے اپنے استاد حسین علی مرزا سے گفتگو کی، جن کی حوصلہ افزائی پر انہوں نے اس موضوع پر لکھنا شروع کیا اور متعدد مضامین تحریر کر ڈالے۔[۲] یہ بین الاقوامی قانون سے ان کی دلچسپی کا آغاز تھا۔ اس کے بعد اسی موضوع پر انہوں نے جامعہ عثمانیہ سے پی۔ایچ۔ڈی کرنا چاہا۔ جس کی انہیں اجازت مل گئی لیکن اس موضوع پر حیدرآباد دکن کی لائبریریوں میں تسلی بخش مواد موجود نہ تھا۔ ان کی جامعہ نے انہیں دنیا کی دیگر لائبریریوں میں جا کر مواد اکھٹا کرنے کی اجازت دی تو انہوں نے حجاز، شام، فلسطین، مصر اور ترکی کا سفر کیا اور پی۔ایچ۔ڈی کے مقالے کا مواد اکھٹا کیا۔ جامعہ عثمانیہ نے ڈاکٹر صاحب کو کمال مہربانی سے وظیفہ دیا تاکہ اپنے تحقیقی سرمائے پر کام کرسکیں۔ یہاں سے ڈاکٹر صاحب بون (جرمنی) پہنچے جہاں انہوں نے صرف نو ماہ میں یعنی اگست ۱۹۳۳ء میں اپنی تھیسس کا صرف ایک حصہ (جو غیر جانبداری کے اصولوں سے متعلق تھا) پیش کر کے ڈی فل کی ڈگری حاصل کر لی۔[۳]

ان کے مقالے کا عنوان Die Neutralitate in Islamischan

Voelkerrecht orthodoxes ''یعنی ''اسلام کے بین الاقوامی تعلقات میں غیر جانبداری کے اصول'' تھا۔ چونکہ ان کو جامعہ عثمانیہ سے ملنے والے وظیفے کی رقم ابھی باقی تھی لہٰذا وہ پیرس (فرانس) چلے گئے اور یہاں سے انہوں نے ۱۹۳۵ء میں ڈی لٹ کی ڈگری لی۔ اس بار ان کے مقالے کا عنوان Documents sur ladiplomatic musullmna'e'epoqe de Prophete at de Khiliphes یعنی ''عہد نبوی اور خلافتِ راشدہ میں اسلامی سفارت کاری'' تھا۔(۴)

وظیفے کی رقم ختم ہونے پر وہ واپس حیدرآباد دکن آئے اور ایک بار پھر جامعہ عثمانیہ سے منسلک ہوگئے۔ وہ یہاں ''قانون بین الممالک'' کے استاد مقرر ہوئے۔ اس وقت اس موضوع پر انگریزی کی چند کتابیں دستیاب تھیں۔ تاہم ان کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا کہ ''بیس برس قبل لکھی گئی یہ کتابیں، عصری تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھیں۔(۵) جبکہ اردو میں اس موضوع پر کوئی کتاب نہیں تھی۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے طلباء کی ضرورتوں کے پیش نظر محض پچیس دنوں میں اس موضوع پر اردو کی پہلی کتاب ''قانون بین الممالک کے اصول ونظریں'' کے نام سے لکھی، جس کا پہلا ایڈیشن، مکتبہ ابراہیمیہ، حیدرآباد سے ۱۹۳۶ء اور دوسرا ایڈیشن ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا۔

گویا اپنی اعلیٰ تعلیم کے سالوں میں اور تدریس کے ابتدائی سالوں میں ڈاکٹر صاحب کا اصل میدانِ تحقیق ''اسلامی قانون بین الممالک'' ہی تھا۔ اسی سلسلہ کا ایک اور اہم کام مشہور مستشرق ارنسٹ نیس کی جدید قانون بین الممالک کے موضوع پر لکھی جانے والی فرانسیسی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ کتاب کی اہمیت اور ترجمہ کی ضرورت واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر حمید اللہ لکھتے ہیں:

> ''ایک تو اپنے موضوع کی مستند اور متداول کتاب ہے، جس کا ہر کوئی حوالہ دیتا ہے۔ مگر اس سے بڑھ کر مولف کی وسعتِ قلبی ہے کہ اپنوں کی کوتاہیوں اور غیروں کی خوبیاں اور احسان ماننے میں اسے ذرا تامل نہیں معلوم ہوتا۔ کم مغربی مولف ہیں جنہوں نے جدید قانون بین الممالک پر کثیر مشرقی اثرات کو اس صراحت سے تسلیم کیا، سراہا اور ثابت کیا۔''(۶)

اپنے مقالے میں ڈاکٹر صاحب نے مزید وضاحت کی ہے کہ مصنف (ارنسٹ نیس) چونکہ مشرقی علوم سے، متعلقہ زبانوں سے عدم واقفیت کی بناء پر، براہِ راست استفادہ نہیں کرسکا ہے اور محض مشہور کتابیں اس کے پیشِ نظر رہی ہیں۔ اس لیے بعض واقعاتی غلطیاں راہ پاگئی ہیں اور کچھ سنی سنائی باتوں کو حقائق سمجھ کر قلم بند کردیا ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے بڑی وسعت قلبی سے اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ مصنف ارنسٹ نیس نے ایسا بر بنائے تعصب وعناد نہیں کیا بلکہ یہ اس کے عدم معلومات کا نتیجہ ہے۔(۷) ڈاکٹر صاحب نے جا بجا حواشی میں متن کی تصحیح وتردید کے ساتھ ساتھ بعض مقام پر اسلامی نکتہ نظر کی بھی وضاحت کردی ہے۔

ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی اپنے ایک مقالے ''ڈاکٹر محمد حمید اللہ اور قانون بین الممالک'' میں تذکرہ کرتے ہیں کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد اقوام عالم میں قانونِ بین الممالک اور اس کی اہمیت کا شدت سے احساس پیدا ہوا۔ چناچہ اقوام متحدہ کا قیام عمل میں آیا اور اس کے لیے ایک منشور ترتیب دیا گیا۔ جس میں باہمی تعلقات کی استواری اور دوسرے مسائل اور نزاعات کے حل کے لیے قوانین وضع کئے گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے اقوام متحدہ کے اس منشور کو بھی اردو میں منتقل کیا۔(۹)

علامہ ابنِ القیم جوزیہ(۱۰) کی ''کتاب احکام اہل الذمہ'' ڈاکٹر صبحی الصالح کی تحقیق کے ساتھ شائع ہوئی۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے اس پر جو پُر مغز مقدمہ لکھا ہے وہ بھی اُن کے بین الاقوامی شعور کا غماز ہے۔ اس میں انھوں نے اسلام کے ملکی اور بین الاقوامی قوانین، غیر مسلم حکومتوں سے تعلقات اور اہل الذمہ کے حقوق و معاملات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔(۱۱)

اس موضوع پر قدما میں امام سرخسی(۱۲) کی شرح السیر الکبیر معرکۃ آلاراء کتاب ہے۔ دراصل السیر الکبیر امام ابوحنیفہ کے شاگرد امام محمد بن حسن شیبانی کی تصنیف کردہ ہے۔ جس میں امام محمد نے جہاد و قتال اور صلح و جنگ کے طریقے، غیر مسلم اقوام سے تعلقات اور تجارت وغیرہ پر بحث کی ہے۔ اور اسلام کے بین الاقوامی قانون کو جاننے کے لیے یہ کتاب بہت اہم ہے۔ امام سرخسی کے زمانے میں جبکہ صلیبی جنگیں لڑی جارہی تھیں، بین الاقوامی تعلقات اور بین الاقوامی قوانین یقیناً زیر بحث رہے ہوں گے اس وقت کے اہم تقاضے کو امام سرخسی نے اس طرح پورا کیا کہ امام محمد کی کتاب ''کتاب السیر الکبیر'' کی شرح لکھوائی۔ یہ شرح جو کئی جلدوں پر مشتمل ہے حیدر آباد دکن اور مصر سے کئی بار شائع ہو چکی ہے۔ اسکی اہمیت کے پیش نظر یونیسکو (UNESCO) نے اسے فرانسیسی زبان میں منتقل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ چنانچہ یہ کام بھی ڈاکٹر صاحب کے قلم سے پایہ تکمیل کو پہنچا۔(۱۳) تاہم یہ کتاب بہ زبان فرانسیسی ابھی تک شائع نہیں ہو سکی۔

ڈاکٹر حمید اللہ کی اسی حوالے سے ایک اور اہم تصنیف ''الوثائق السیاسیۃ فی العھد النبوی والخلافۃ الراشدہ'' ہے۔ دو حصوں پر مشتمل اس کتاب میں رسول اللہ کے مکتوبات اور ان کے دریافت جوابات، فرامین، معاہدے، دعوت اسلامی، عمّال کی تقرری، اراضی کے عطیات، آمان نامے، وصیت نامے وغیرہ شامل ہیں۔ دوسرے حصے میں عہدِ خلافتِ راشدہ کی دستاویزات کو یکجا کیا گیا ہے۔(۱۴)

اس موضوع پر ڈاکٹر حمید اللہ کی ایک اور اہم کتاب The Muslim Conduct of State ہے۔ اس میں قانون بین الممالک کی غرض، اساس اور اس کے ماخذ سے بحث کی گئی ہے اور ماقبل اسلام قانون بین الممالک کی تاریخ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ موضوع کے دوسرے گوشوں مثلاً آزادی، اختیارات، سفارت، جنگ، بغاوت، ڈاکہ زنی، جنگی قیدیوں اور دشمنوں کے ساتھ سلوک، فوج میں مسلم خواتین وغیرہ جیسے موضوعات پر ڈاکٹر صاحب نے نہایت عمدہ بحث و تحقیق پیش کی ہے۔ اس کے بارے میں مولانا ابوالجلال ندوی(۱۵) لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کے بین الاقوامی آئین پر یہ پہلی کتاب ہے جو اس زمانے کی ضرورتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے لکھی گئی ہے۔ تنگ اور محدود نسلی اور جغرافیائی قومیت کی پیدا کردہ عالم گیر کشمکش کی وجہ سے اب دنیا کا رجحان بین الاقوامیت کی طرف بڑھ رہا ہے اور یہ وسعت صرف اسلام ہی میں مل سکتی ہے۔ اس لیے اسلام کے بین الاقوامی قوانین کو پیش کرنا ایک بڑی مفید خدمت ہے۔''(۱۶)

اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کتاب کے ۱۹۹۶ء تک چھ ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ ترکی زبان میں اسکا ترجمہ بھی ہوا۔ یہ کتاب، پاکستان، انڈیا، ترکی کے علاوہ جرمنی سے بھی شائع ہوتی رہی ہے۔ اس کے ہر ایڈیشن میں ڈاکٹر صاحب اضافے اور نظرثانی کر کے اُسے پہلے سے بہتر بناتے رہے۔

ڈاکٹر صاحب کی ایک اور کتاب First written constitution in the world ہے۔(۱۷) جس میں رسول اللہ کے میثاقِ مدینہ پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے اُسے پہلا عالمی دستور قرار دیا گیا ہے اور نہایت مدلل انداز میں ثابت کیا ہے کہ مدینہ کو پہلی کثیر قومی و نسلی اور مذہبی وفاق ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اس سلسلے کی ایک اور انگریزی کتاب The Prophet establishing a state بھی ہے۔ جسے پاکستان ہجرہ کونسل نے اسلام آباد سے ۱۹۸۸ء میں شائع کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی بعض وہ کتابیں جو بظاہر سیرت پر ہیں۔ مثلاً رسول اکرم کی سیاسی زندگی، عہد نبوی کے میدان جنگ، اور عہد نبوی میں نظام حکمرانی وغیرہ۔ ان میں بھی قانون بین الممالک کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا انداز نہایت محققانہ اور مدلل ہوتا تھا ان کی تمام تحریریں اس کا ثبوت ہیں بطور خاص قانون بین الممالک کے میدان میں ان کا کام اپنے ہم عصر مفکرین میں نہایت منفرد تھا، انہوں نے قدیم نظریہ سیئر میں اضافے بھی کئے، اگر یہ کہا جائے کہ اسلامی قانون بین الممالک کے ارتقا اور اس کی تشکیل نو میں ڈاکٹر حمید اللہ کا بڑا کردار ہے تو غلط نہ ہوگا۔ اس کی تصدیق کے لیے ڈاکٹر حمید اللہ کی تحریروں اور خطبات کا سہارا لیا گیا ہے جن کو مندرجہ ذیل نکات کی صورت میں سمیٹا جاسکتا ہے۔

۱۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے لفظ انٹرنیشنل لاء (International law) جس کے لیے عموماً بین الاقوامی قانون کا لفظ مستعمل ہے۔ عمداً ''قانون بین الممالک'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ قانون اصل میں سلطنتوں یا حکومتوں کے آپس کے تعلقات سے متعلق ہوتا ہے۔ حالت جنگ میں بھی اور حالت امن میں بھی سلطنت کے باشندوں کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یعنی دو قوموں کے تعلقات سے اس میں بحث نہیں ہوتی بلکہ دو مملکتوں کے معاملات و مفادات سے بحث ہوتی ہے لہٰذا ''قانون بین الممالک'' کا لفظ زیادہ موزوں ہے۔(۱۸) ابتداء میں International law کی جگہ ڈاکٹر حمید اللہ اسے Inter state law کہتے رہے۔(۱۹)

۲۔ قانون بین الممالک (یعنی علم السیر) ایک ایسا علم ہے جو مسلمانوں کا رہین منت ہے اور مسلمانوں نے ہی سب سے پہلے اسے علم کے طور پر متعارف کیا۔ مغربی اہلِ قلم اور دانشور یہ بات بہت زور دے کر کہتے ہیں کہ جدید بین الاقوامی قانون مغربی مفکرین کی کاوشوں کا مرہونِ منت ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ جدید بین الاقوامی قانون کی داغ بیل سترھویں صدی کے ایک مفکر گروشش (۹۹۱ھ تا ۱۰۵۵ھ/۱۵۸۳ء تا ۱۶۴۵ء) نے ڈالی۔ ڈاکٹر صاحب نے مغرب کے اس دعویٰ کو رد کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ بین الاقوامی قانون اپنی عالمگیر اور آفاقی صورت میں صرف مسلمانوں کا رہنِ منت ہے۔ اس نوع کا قانون بین الممالک سب سے پہلے مسلمانوں نے ہی ایجاد کیا۔ (۲۰) یہ قانون بلا تفریقِ ملت، رنگ و نسل، تمام اقوام کے لیے یکساں ہے۔ یہ شریعت کا حصہ ہے اور ہر اسلامی مملکت اور ہر مسلمان حکمران کے لیے واجب الاتباع ہے۔

۳۔ بعض مغربی علماء یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ علم پہلے پہل یونانیوں نے متعارف کرایا لیکن ڈاکٹر حمید اللہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ بعض مغربی مصنّفین ہی کے بیان سے اس دعویٰ کو مسترد کرتے ہیں۔ ان مغربی مصنّفین کے بیان کے مطابق یونان کی شہری ریاستوں میں اگر باہمی تعلقات کے حوالے سے کچھ معین قاعدے تھے تو وہ صرف اپنے ہم نسل یونانیوں کے ساتھ برتاؤ سے متعلق تھے۔ یعنی ایک یونانی شہری ریاست دوسری یونانی شہری ریاست کے ساتھ تعلقات میں چند معین قواعد پر عمل کرتی دیگر باقی ساری دنیا کو وحشی قرار دے کر انہیں اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ ان کے ساتھ کسی معینہ قاعدے قانون کے تحت معاملات کریں۔ گویا یونانیوں کے پاس اگر انٹرنیشنل لاء تھا تو یہ قوانین جہاں اپنے اطلاق میں محدود تھے۔ وہیں وہ دوسری اقوام کے حوالے سے امتیازی بھی تھے۔ (۲۱) یونان کا سب سے بڑا فلسفی ارسطو غیر یونانیوں کے بارے میں یہ فیصلہ دیتا ہے کہ ''فطرت نے انہیں یونانیوں کا غلام بننے کے لیے پیدا کیا ہے اور ان کے متعلق یونانی اپنی صوابدید پر جو چاہے عمل کر سکتا ہے۔'' (۲۲)

۴۔ ڈاکٹر حمید اللہ بعض یورپی مصنّفین کے اس دعویٰ کو بھی مسترد کرتے ہیں کہ یہ بین الاقوامی قانون International Law رومیوں کے ہاں ملتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ رومیوں کے ہاں جنگ و امن کے حوالے سے کچھ قوانین ضرور تھے لیکن یہ قوانین ساری دنیا کے لیے نہیں تھے۔ صرف ان ممالک کے لیے تھے جن کے ساتھ رومیوں کے معاہدے ہوتے تھے۔ اس موقع پر ڈاکٹر حمید اللہ مشہور انگریز مورخ اوپن ہائم جس نے انٹرنیشنل لاء پر ضخیم کتاب تحریر کی، کے حوالے سے کہتے ہیں کہ رومیوں کا دعویٰ تھا کہ یہ کرۂ ارض رومیوں کا ہے۔ یعنی پوری دنیا رومیوں کی ملکیت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کوئی اپنے گھر کے اندر قانون بین الممالک کا استعمال نہیں کرتا۔ (۲۳)

۵۔ اس کے بعد یکا یک ایک ہزار سال کی جست لگا کر یورپی مورخین کہتے ہیں کہ بین الاقوامی قانون

(International Law) چودھویں، پندرھویں صدی میں شروع ہوتا ہے اس دوران گزرنے والے اسلامی دور کا، مغربی مورخین کچھ تذکرہ نہیں کرتے۔ بہرحال مغربی مورخین جسے 'جدید بین الاقوامی قانون' Modern International Law کہتے ہیں، ڈاکٹر حمید اللہ اس کو بھی تسلیم کرنے پر تیار نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء تک معینہ قاعدوں پر یورپ میں صرف عیسائی سلطنتوں کے آپس کے تعلقات کے ضمن میں عمل کیا جاتا رہا۔ ان کے بین الاقوامی قانون کا غیر عیسائی ریاستوں پر اطلاق نہیں ہوتا۔ ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء میں پہلی مرتبہ مجبوراً یورپی عیسائی سلطنتوں نے اعتراف کیا کہ ان قوانین کا اطلاق ایک غیر عیسائی سلطنت (یعنی سلطنت عثمانیہ) کے ساتھ بھی ہوگا۔ تاہم اس کے بعد پھر ساٹھ ستر سال تک کسی غیر عیسائی ریاست کو ان قوانین کا حقدار نہیں سمجھا گیا۔ (۲۴)

۶۔ ڈاکٹر حمید اللہ لیگ آف نیشنز اور اقوام متحدہ کے انٹرنیشنل لاء کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں کیونکہ اقوام متحدہ میں بھی ہر ملک کو اپنی ذاتی حیثیت سے رکن نہیں بنایا جاتا جب تک کہ کم از کم دو ایسی سلطنتیں جو پہلے سے اقوام متحدہ کی ممبر ہوں، سفارش نہ کریں، اور یہ اطمینان نہ دلائیں کہ یہ واقعی متمدن سلطنتیں ہیں اور اس بات کی مستحق ہیں کہ ان کے ساتھ انٹرنیشنل لاء کے مطابق عمل کیا جائے۔ اس کے برعکس اسلامی انٹرنیشنل لاء میں اس فرق اور امتیاز کی کوئی گنجائش نہیں کہ کوئی دوسرا ملک مسلمانوں کے معیار کے قواعد وضوابط پر عمل کرتا ہے یا نہیں۔ (۲۵)

۷۔ ڈاکٹر حمید اللہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قانون بین الممالک جو حقیقت میں بین الممالک بھی ہے اور قانون بھی ہے مسلمانوں سے شروع ہوتا ہے۔ وہ اس کا آغاز رسول اللہ کی سیرت سے کرتے ہیں۔ ہجرت سے قبل مکہ میں State within state کی کیفیت میں، ازاں بعد مدینہ میں جب ایک اسلامی ریاست کی داغ بیل ڈالی گئی تو دیگر ممالک اور خودمختار اکائیوں سے ان کے تعلقات، امن و جنگ کا آغاز ہوا اور رسول اللہ ﷺ کا طرز عمل مسلمانوں کے لیے نظیر بنتا گیا۔ گویا رسول اللہ ﷺ کی سیرت اور بعد ازاں ان کے خلفاء کے طریق کار میں وہ تمام اصول وضع ہو گئے جس پر آگے فقہا اضافہ کرتے رہے اور ایک واقعی ہمہ گیر نوعیت کا انٹرنیشنل لاء وجود میں آیا جس کو علم السیر کا نام دیا گیا۔ (۲۶)

۸۔ اسلامی قانون بین الممالک تمام حکومتوں (خواہ مسلم ہوں یا غیر مسلم) کے لیے ہے اس میں مذہب، علاقہ، نسل وغیرہ کی بنیاد پر کسی قوم کے ساتھ کوئی امتیاز روا نہیں رکھا گیا ہے۔ (۲۷) اسلامی قانون بین الممالک اسلامی شریعت کا ایک حصہ ہے چنانچہ غیر مسلم اقوام کے ساتھ بھی معاہدات کی پابندی اسی طرح واجب ہے جس طرح دیگر عبادات۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اسلامی قانون بین الممالک کا حصہ غیر مسلم قوموں کے ساتھ عدل وانصاف پر مبنی تعلقات استوار کرنا ہے۔ یہ قانون اپنے پیچھے ایک مضبوط اور موثر قوت نافذہ رکھتا ہے۔ اس کی قوت نافذہ جہاں ریاست کی قوت قاہرہ اور اس کا قانونی نظام ہے، وہیں فکر آخرت اور خدا کے سامنے جوابدہی جیسے مفاہیم بھی ہیں۔ (۲۸)

۹۔ ڈاکٹر صاحب مسلمانوں کے علم السیر کے ارتقا کی تاریخ بتاتے ہوئے اطلاع دیتے ہیں کہ علم السیر پر قدیم ترین تحریر امام زید ابن علی (م ۱۲۰ھ/۷۳۸ء)[۲۹] کی کتاب ''المجموع فی الفقہ'' کا ایک باب ہے جس کو ''کتاب السیر'' کا نام دیا گیا ہے، علم السیر پر پہلی کتاب امام ابوحنیفہ (م ۱۵۰ھ/۷۶۷ء) کی تھی جس کے بعض نکات سے ان کے ہم عصر امام اوزاعی[۳۰] نے سخت اختلاف کیا اور اس کے خلاف ایک رسالہ لکھا۔ تاہم یہ دونوں کتابیں امام ابوحنیفہ کی کتاب اور امام اوزاعی کا رسالہ ضائع ہو گئیں۔ امام ابوحنیفہ کے ایک اور اہم شاگرد امام ابو یوسف (م ۱۸۳ھ/۷۹۶ء) نے امام اوزاعی کے نکات کو رد کرتے ہوئے ''الرد علی سیر الاوزاعی'' کتاب لکھی۔ یہ کتاب محفوظ ہے اور اس سے امام ابوحنیفہ اور امام اوزاعی کے اختلافی نکات وغیرہ سامنے آتے ہیں۔ امام شافعی کی ''کتاب الام''[۳۱] میں بھی امام اوزاعی کے رسالے کے کچھ اقتباسات ملتے ہیں۔

امام ابوحنیفہ کے تین اور شاگردوں نے علم السیر کے موضوع پر کتابیں لکھیں۔ ان میں امام محمد الشیبانی، امام زفر اور فزاری کے نام شامل ہیں۔ اول الذکر نے اس موضوع پر دو کتابیں لکھیں:

۱۔ کتاب السیر الکبیر

۲۔ کتاب السیر الصغیر

اول الذکر کی شرح پانچویں صدی ہجری کے مشہور حنفی فقیہ امام سرخسی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ نے کی۔ آج دنیا میں اس موضوع پر محفوظ رہ جانے والی اور شائع ہونے والی قدیم ترین کتاب یہی ''شرح السیر الکبیر'' ہے۔ بعض اور ممتاز فقہاء و علماء نے اس موضوع پر کام کیا چنانچہ امام مالک (م ۱۷۹ھ/ ۷۹۵ء) نے بھی کتاب السیر کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ تاہم یہ کتاب اب ناپید ہے۔ اسی طرح ان کے ایک اور معاصر مورخ واقدی نے بھی ''کتاب السیر'' کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ وہ بھی اب نایاب ہے۔ تاہم امام شافعی کی ''کتاب الام'' میں ''سیر الواقدی'' کے نام سے ایک طویل اقتباس شامل ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ علم السیر پر لکھی جانے والی ان کتابوں اور رسائل کو ابتدائی اور آخری قرار دیتے ہیں۔ یعنی ایک خاص زمانے میں کسی خاص ضرورت سے مستقل کتابیں لکھی جانے لگیں۔ پھر اس کے بعد شاید ضرورت نہ رہی۔ اور یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ لیکن اس علم سے مسلمانوں کی دلچسپی برابر برقرار رہی۔ وہ اس طرح کہ فقہ کی جتنی کتابیں ابتداء سے لے کر آج تک لکھی گئی ہیں ان سب میں کتاب السیر کا باب ضرور ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ سترہویں صدی عیسوی میں مرتب کی جانے والی ''فتاوائے عالمگیری'' میں بھی اس پر ایک باب ہے۔

۱۰۔ بعض مستشرقین کے خیال میں اسلام میں غیر جانبداری کا تصور نہیں۔ وہ دنیا کو دارالسلام اور دارالحرب کے دو متحارب بلاکوں میں تقسیم کرتا ہے ان کے درمیان وہ کسی تیسرے بلاک کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا۔ یہ نظریہ ایک مستشرق مجید قدوری نے اپنی کتاب Islamic Law for War

and Peace میں دیا جو ۱۹۵۵ء شائع ہوئی۔ ایک اور مشہور مستشرق برنارڈ لیوس نے بھی Political Language of Islam میں جو شکاگو یونیورسٹی سے ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی، اس خیال کا اظہار کیا اور اسلام کو ایک استعماری نظام کے طور پر پیش کیا۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے ان مستشرقین کی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا۔ بون یونیورسٹی میں پیش کیا جانے والا ڈاکٹر صاحب کی تھیسس کا عنوان ہی ''اسلام کے بین الاقوامی تعلقات میں غیر جانبداری کے اصول'' تھا۔ جس کے بعد مستشرقین کے مذکورہ بالا نظریات خود ہی بے بنیاد ٹھرتے ہیں۔

۱۱۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے خیال میں گو کہ اسلام کا پیغام عالمی و آفاقی ہے۔ جس کا تقاضا پوری دنیا میں اللہ کے دین کا غلبہ اور اس کے نظام کا قیام ہے۔ تاہم اس کا مطلب غیر مسلم ریاستوں کے حق بقا کی نفی نہیں ہے۔ اسلام مسلمانوں کو ایسی تمام اقوام کے ساتھ پر امن تعلقات کی ہدایت کرتا ہے جو مسلمانوں کے ساتھ جنگ سے احتراز کریں اور صلح اور امن کے ساتھ رہنا چاہیں۔ دوسرے الفاظ میں اسلام کے نظریہ سیر میں ریاستوں کے پر امن بقائے باہمی کا وہ اصول تسلیم کیا گیا ہے جو آج کے بین الاقوامی تعلقات کی بنیاد ہے اور ڈاکٹر حمید اللہ نے اس تصور کو اہل علم اور اہل یورپ کے سامنے پورے استدلال سے پیش کیا ہے جس نے جدید نظریہ سیر پر گہرے اثرات ڈالے ہیں۔

۱۲۔ اک اور مسئلہ جو بعض مستشرقین کی طرف سے پیش کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کے باقی قوانین کے برعکس اسلامی قانون کا دائرہ اختصاص اور اس کی علاقائی حدود عمل متعین نہیں ہیں۔ یہ ایک شخصی قانون ہے جو دنیا کے ہر خطے میں رہنے والے مسلمانوں پر لاگو ہوتا ہے۔[۳۲] ڈاکٹر حمید اللہ نے بہت مدلل انداز میں اس اشکال کا جواب دیا ہے اور واضح کیا ہے کہ اسلامی قانون جہاں ایک شخصی قانون ہے وہیں یہ ایک متعین علاقائی دائرہ اختصاص بھی رکھتا ہے۔[۳۳] ایک اسلامی ریاست اپنی فوجداری و تعزیری قوانین صرف انہی لوگوں پر نافذ کر سکتی ہے جو اس کے اپنے حدود عمل میں رہتے ہیں۔[۳۴] ریاست کے حدود عمل کا متعین حدود ارض تک ہونے کا جو تصور ڈاکٹر حمید اللہ نے پیش کیا ہے وہ درحقیقت معاصر سیاسی فکر یعنی علاقائی اقتدار اعلیٰ Territorial Sovereignty کی ایک بازگشت ہے۔ اس سے اسلامی ریاست ان الجھنوں اور اشکالات سے بچ جاتی ہے جو اسلامی ریاست کے ماوراالحدود قرار دینے سے پیدا ہوتی ہیں۔

الغرض ڈاکٹر محمد حمید اللہ عصر جدید میں مسلمانوں میں قانون بین الممالک کے پہلے ایسے ماہر ہیں جنہوں نے مختلف زبانوں سے واقفیت کے سبب، مختلف قدیم، جدید قوموں اور ملکوں کے بین الممالک اصول و تصورات اور قوانین کا مطالعہ کیا اور کتابیں و مقالات قلم بند کئے۔ وہ یورپ کے قدیم و جدید قوانین بین الممالک سے اسلام کے قوانین بین الممالک کا بعض مقامات پر موازنہ و مقابلہ کر کے واضح کرتے ہیں کہ اسلامی قوانین ہر لحاظ سے بہتر ہیں۔[۳۵] وہ قانون بین الممالک کی تشریح میں یورپ

اور امریکہ کے ساتھ تاریخ اسلام اور فقہ اسلامی سے بھی استدلال کرتے ہیں کیونکہ وہ خوب واقف ہیں کہ مغربی اہل قلم عموماً اسلامی تاریخ کے محاسن کو نظر انداز کرتے ہیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ چونکہ مستشرقین کے طریقہ سے خواب واقف تھے اس لیے وہ دلائل و براہین کے ساتھ ابتدائی ماخذ کے حوالے دے کر یورپ کے پیمانہ تحقیق ہی کے مطابق ان کو جوابات دیتے ہیں۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی کہتے ہیں:

> ''ڈاکٹر محمد حمید اللہ کو بلاخوف وخطر دور جدید میں اسلام کے بین الاقوامی قانون کا مجدد اور مؤسس نو قرار دیا جاسکتا ہے اگر امام محمد بن حسن شیبانی قدیم علم السیر کے مؤسس اول اور مدون ہیں تو ڈاکٹر حمید اللہ یقیناً جدید بین الاقوامی اسلامی قانون کے موسس و مدوّن ہیں اور بیسویں صدی کے شیبانی کہلائے جانے کے بجا طور پر مستحق ہیں۔''(۳۶)

حواشی وحوالہ جات

۱۔ پروفیسر خورشید احمد، ڈاکٹر محمد حمید اللہ، مشمولہ فکر ونظر، ص ۱۳، اسلام آباد،

۲۔ ڈاکٹر حمید اللہ ''The Muslim Conduct of State'' (شیخ محمد اشرف، لاہور، ۱۹۹۶ء) ص ۸ پہلے ایڈیشن کا پیش لفظ، (تحریر کی تاریخ ۱۹۴۱ء)

۳۔ ایضاً

۴۔ ایضاً

۹)۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ ''قانون بین الممالک'' (مکتبہ ابراہیمہ، حیدرآباد دکن، طبع ثانی، ۱۳۶۴ھ) ص ۱۸ (پہلی اشاعت کا پیش لفظ)

۶۔ ارنسٹ نیس، 'جدید قانون بین الممالک کا آغاز' ترجمہ: ڈاکٹر حمید اللہ ص، ط (جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن ۱۹۴۵ء)

۷۔ ایضاً

۸۔ دیکھئے، سہ ماہی فکر ونظر، ص ۲۰۲، اسلام آباد،

۹۔ یہ ترجمہ ڈاکٹر حمید اللہ کی کتاب ''قانون بین الممالک'' کے دوسرے ایڈیشن کے آخر میں ضمیمہ کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔ اور یہ دستور اقوام متحدہ کا خلاصہ ہے۔ جبکہ اصل دستور ایک سو گیارہ دفعات پر مشتمل اور انیس ۱۹ ابواب میں منقسم ہے۔

۱۰۔ شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن ابی بکر بن ایوب بن سعد الزدّعی ۶۹۱ھ/ ۱۰۹۸ء میں دمشق میں پیدا ہوئے۔ ابن القیم نے اپنے دور کے مشہور شیوخ سے علوم کی تکمیل کی۔ ۷۱۲ھ میں جبکہ ابن القیم بیس اکیس سال کے نوجوان تھے۔ اپنے وقت کے مشہور عالم ابن تیمیہ مصر سے مراجعت کر کے دمشق میں مقیم ہوئے تو ابن القیم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ابن تیمیہ کی وفات (۷۲۸ھ) تک ایک لمحہ کے

لیے بھی ان کی مفارقت گوارہ نہ کی۔حتیٰ کہ جب ابن تیمیہ کو ان کے انقلابی نظریات کی وجہ سے دمشق کے قلعہ میں قید کیا گیا تو ابن القیم بھی ان کے ساتھ زندان میں رہے۔وہ ابن تیمیہ کے صحیح جانشین اور ان کے علوم کے صحیح معنوں میں حامل تھے۔مسلک ابن تیمیہ کی تائید کی وجہ سے انہیں ساری زندگی مسائل کا سامنا کرنا پڑا،انہوں نے ساٹھ سال کی عمر میں ۷۵۱ھ/۱۳۵۰ء میں دمشق میں انتقال کیا۔انہوں نے پچاس کے لگ بھگ کتابیں تحریر کیں۔جن میں اب زیادہ تر دستیاب نہیں۔تاہم بعض مشہور کتابوں میں ''زاد المعاد'' اور ''اعلام الموقّعین عن رب العالمین'' ہیں۔جن کا اردو میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔(دائرہ معارف اسلامیہ،دانشگاہ پنجاب،لاہور۔طبع ثانی ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۲ھ جلد ا،ص ۶۵۱ تا ۶۵۳)

۱۱۔ سہ ماہی فکر ونظر،اسلام آباد،ص ۲۰۲ (مقالہ نگار،ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی)

۱۲۔ گیارہویں صدی عیسویں کے ممتاز عالم،شمس الائمہ ابوبکر محمد بن ابی سہیل احمد مشہور حنفی فقیہ تھے۔وہ ۴۰۰ھ/۱۰۰۹۔۱۰۱۰ء میں غالباً سرخس میں پیدا ہوئے۔جو مشہد اور مرو کے درمیان واقع ہے۔نوجوانی میں وہ بخارا جا کر شمس الائمہ عبدالعزیز الحلوانی کے شاگرد بنے۔اور علوم وفنون میں اسقدر امتیاز حاصل کر لیا کہ جب استاد کی وفات ہوئی (۴۴۸ھ/۱۰۵۶ء) تو ان کی مسند درس کے ساتھ ان کا لقب (شمس الائمہ) کے بھی وارث قرار پائے۔حروب صلبیہ کے باعث یہ بڑا پر آشوب زمانہ تھا۔شاید ان جنگوں ہی کے پیش نظر،سرخسی نے قتال وجنگ سے متعلق فقہی احکام ومسائل پر مستقل امام محمد شیبانی کی اہم تالیف السیر الکبیر کی شرح بھی،بحالت قید اپنے شاگردوں کو املا کرائی۔اس کے علاوہ امام محمد ہی کی ''کتاب المبسوط'' کی شرح بھی حالت قید میں اپنے شاگردوں کو املا کرائی،یہ قاہرہ سے تیس ۳۰ جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔

(ڈاکٹر محمد حمید اللہ وادارہ،مادہ سرخسی،مشمولہ دائرہ معارف اسلامیہ،طبع اول،ص ۸۱۱ تا ۸۱۵)

۱۳۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ،'خطبات بہاولپور،ص ۱۲۵ (اسلامیہ یونیورسٹی،بہاولپور،۱۹۸۱ء)

۱۴۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ،'مجموعہ الوثائق السیاستہ فی العھد النبوی والخلافتہ الراشدہ'،(مطبوعہ لجنۃ التالیف والترجمہ والنشر،قاہرہ،۱۹۴۱ء)اس کتاب کا اردو ترجمہ مولانا ابو یحییٰ نوشہری نے کیا جو لاہور سے شائع ہوا ہے۔

۱۵۔ مولانا ابوالجلال ندوی موجودہ اعظم گڑھ کے قصبہ محی الدین پور میں ۱۸۹۴ھ میں صدیقی شیوخ کے خانوادے میں پیدا ہوئے،ابتدائی تعلیم یہیں سے،جبکہ اعلیٰ تعلیم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے حاصل کی،یہاں ان کے اساتذہ میں مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا حفیظ اللہ ہندی اعظم گڑھی کو امتیاز حاصل ہے۔ماہر علوم قدیم وجدید مولانا حمید الدین فراہی (م ۱۹۳۰ء) سے علی الخصوص علوم قرانیہ وعربیہ سے تحصیل کی، ندوۃ سے فارغ ہونے کے بعد ایک عربی مدرسہ میں تدریس کے فرائض انجام دینے لگے۔جلد ہی ان کے استاد سید سلیمان ندوی نے انہیں دارالمصنّفین،اعظم گڑھ بلا لیا یہاں انہوں نے قلیل مشاہرہ پر دس سال تک علمی وتحقیقی کام کیا۔بعد ازاں مدراس چلے گئے۔وہاں کے تعلیمی ادارہ جامعہ عربیہ سے منسلک ہو گئے۔یہاں انہیں عربی زبان میں مہارت حاصل ہوئی وہ عبرانی زبان سے بھی واقف تھے۔مدراس

میں ۲۰ سال قیام کے بعد وہ ایک بار پھر دارالمصنّفین اعظم گڑھ سے وابستہ ہو گئے۔ کچھ عرصے کے بعد وہ دوبارہ مدراس چلے گئے جہاں کے عربی مدارس میں درس و تدریس کے ساتھ ہی مضامین بھی لکھتے رہے۔ ۱۹۵۹ء میں کراچی منتقل ہوئے، یہاں ان کا قیام ۲۵ سال رہا، وہ اس عرصہ میں آزادانہ طور پر تحقیق اور علمی کاموں میں مصروف رہے، نوے سال کی عمر میں اکتوبر ۱۹۸۴ء میں انتقال کیا، اور سعود آباد کے قبرستان میں دفن ہوئے ان کا بیشتر علمی کام قلمی مسودات کی شکل میں موجود ہے۔ اور زیادہ تر غیر مطبوعہ ہے۔ (علی محسن صدیقی، مضامین تاریخی ص ۳۱۶ (قرطاس، کراچی ۲۰۰۶ء)

۱۶۔ مولانا ابوالجلال ندوی۔ مطبوعات جدید ص ۳۱۷ (ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۴۸ء)

۱۷۔ لاہور سے ۱۹۶۸ء تک اس کتاب کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

۱۸۔ ڈاکٹر حمید اللہ، 'خطبات بہاولپور'، ص ۱۱۵

۱۹۔ ظفر اسحٰق انصاری، 'ڈاکٹر محمد حمید اللہ مشاہدات و تاثرات'، مشمولہ فکر و نظر، ص ۱۲، اسلام آباد

۲۰۔ ڈاکٹر حمید اللہ The Muslim Conduct of State، ص ۱۷

۲۱۔ 'خطبات بہاولپور'، ص ۱۱۷

۲۲۔ ارسطو، 'سیاسیات' مترجم سید نذیر نیازی۔ ص ۴۲۔۴۱ (مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۵۹ء)

۲۳۔ 'خطبات بہاولپور'، ص ۱۱۸

۲۴۔ ایضاً

۲۵۔ ایضاً

۲۶۔ ایضاً

۲۷۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ (مقدمہ) ''احکام اھل الذمۃ'' از علامہ ابن القیم، ص ۸۲ (دارالعلم للملایین طبع اول، ۱۱۸۲ھ)

۲۸۔ ڈاکٹر حمید اللہ The Muslim Conduct of State، ص ۱۷

۲۹۔ زید ابن علیؒ زین العابدین، حضرت حسینؓ کے پوتے ہیں، اور شیعوں کے فرقۂ زیدیہ کے بانی، ایک معنوں میں وہ امام ابوحنیفہ کے استاد سمجھے جاتے ہیں، زید ابن علی نے اموی خلافت کے خلاف بغاوت کی، لیکن ان کے ساتھیوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ آخر کار وہ گرفتار ہوئے اور قتل کر دیئے گئے۔ یہ ۱۲۰ھ یا ۱۲۲ھ کا واقعہ ہے۔ اس وقت اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک کا دور حکومت تھا۔

۳۰۔ ابوعمرو بن عبدالرحمٰن بن عمرو، جو امام اوزاعی کے نام سے مشہور ہوئے ۸۸ھ/۷۰۷ء میں دمشق کے نواحی قصبے اوزاع میں پیدا ہوئے۔ یہ شام میں فقہ اسلامی کے سب سے بڑے نمائندہ تھے۔ اور ''امام اہل شام'' کہلاتے تھے۔ ان کا انتقال بیروت میں ۱۵۷ھ/۷۷۴ء میں تقریباً ستر سال کی عمر میں ہوا۔ یہ امام ابوحنیفہ کے ہمعصر تھے۔ اور ایک علیحدہ فقہی مسلک کے بانی تھے۔ فقہ پر ان کی کوئی کتاب محفوظ نہ رہ سکی۔ تاہم ان کی 'کتاب السیر' کا ایک اصلی نسخہ جو ان کے شاگرد نے تیار کیا تھا، گیارہویں صدی ہجری /

ستر ہویں صدی عیسوی تک موجود تھا۔(دائرہ معارف اسلامیہ طبع سوم) ج ۳،ص ۵۳۵

۳۱۔ خطبات بہاولپور میں امام شافعی کی کتاب کا نام ''کتاب الدم'' لکھا ہے۔ جو درست نہیں کتاب کا نام ''کتاب الام'' ہے جو امام شافعی کی مشہور زمانہ کتاب ہے۔

۳۲۔ مجید قدوری Islamic Law of Nation ص ۷ (بالٹی مور ۱۹۴۴ء)

۳۳۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ he Islamic Review جولائی اگست ۱۹۶۶ء (پروفیسر مجید قدوری کی کتاب Islamic Law of Nation پر حمید اللہ کا تبصرہ)

۳۴۔ ڈاکٹر حمید اللہ The Muslim Conduct of State ص ۱۶

۳۵۔ 'خطبات بہاولپور'، ص ۱۳۱

۳۶۔ محمود احمد غازی، ''علوم اسلامیہ میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی خدمات'' ص ۸۵ (مشمولہ فکر و نظر،)